سلسلہ نمبر۱۲

"الحامد ٹرسٹ" نزد جامعہ مدنیہ جدید رائیونڈ روڈ لاہور کی جانب سے شیخ المشائخ محدثِ کبیر حضرت اقدس مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اہم خطوط اور مضامین کو سلسلہ وار شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے جو تا حال طبع نہیں ہو سکے جبکہ ان کی نوع بنوع خصوصیات اس بات کی متقاضی ہیں کہ افادۂ عام کی خاطر اِن کو شائع کر دیا جائے۔ اسی سلسلہ میں بعض وہ مضامین بھی شائع کیے جائیں گے جو بعض جرائد و اخبارات میں مختلف مواقع پر شائع ہو چکے ہیں تا کہ ایک ہی لڑی میں تمام مضامین مرتب و یکجا محفوظ ہو جائیں۔ (ادارہ)

قرآن پاک کا کلامِ الٰہی ہونا

یہ اللہ کی صفت ہے اور مخلوق نہیں ہے

﴿ نظر ثانی و عنوانات : مولانا سیّد محمود میاں صاحب ﴾

حضرت اقدسؒ کا یہ مضمون آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے

قرآنِ پاک کلامِ الٰہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا۔ قرآنِ مجید کے الفاظ کو تعظیماً لفظ نہیں بولتے بلکہ "نظم" کہتے ہیں، کیونکہ لفظ کے لغوی معنی ہیں "پھینکنا" اور چونکہ انسان آواز کے ذریعہ کلمات کو ایسے خارج کرتا ہے کہ جیسے پھینک رہا ہو، اس لیے کلمات کو الفاظ کہا جانے لگا۔ "نظم" کے لغوی معنی ہیں پرونا جیسے موتی پروئے جاتے ہیں اور موتی وغیرہ قابلِ عزت اور قیمتی چیزیں ہیں۔ اس لیے مفسرینِ کرام نے قرآن پاک کی عبارت کو نظم کہنا پسند کیا ہے اور شعراء بھی اپنے چند اشعار کے مجموعہ کو "نظم" کہتے ہیں۔ غرض قرآن پاک کی نظم اور معنی دونوں ہی "کلام اللہ" ہیں، دونوں کے مجموعہ کا نام "قرآن" ہے۔ اس کی عظمت جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ مبارکہ کا جاننا ضروری ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ سہل زبان میں یہ مضمون پیش کروں واللّٰہ المُستَعان .

آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنیٰ ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے نام ہیں جیسے ایک آدمی میں جب کوئی نمایاں صفت نظر آتی ہے تو اُسے اُس کا نام دے دیا جاتا ہے مثلاً کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب،

حافظ صاحب اور کسی آدمی میں یہ دونوں وصف جمع ہو جائیں تو اُسے اُس کا نام ڈاکٹر حافظ ملا کر لیا جانے لگے۔ نام کے ساتھ اُس کے یہ دونوں نمایاں اوصاف ذکر کیے جانے لگیں۔ اسی طرح اللہ تو ذاتِ پاک کا نام ہے اور باقی اس کے اوصاف ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی ہر صفت اپنے موقع و محل کے اعتبار سے اپنی جگہ دوسری صفت سے الگ ہے چاہے یہ شبہ ہوتا ہو کہ یہ بظاہر ایک ہی ہیں مثلاً رَحْمٰنْ رَحِیْمْ رَءُوْفْ وَدُوْدْ اللہ پاک کے اسماء صفات ہیں جن کے قریب قریب ایک جیسے معنی نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ہر صفت دوسرے سے جدا ہے جیسے تربوز کا میٹھا ہونا خربوزہ سے آم سے انگور سے کھجور سے اور شہد وغیرہ سے مختلف ہے بلکہ اِن کی تاثیرات تک میں فرق ہے کہ جسمِ انسانی پر جدا جدا اثر مرتب ہوتا ہے حتی کہ شہد کو ڈاکٹر ذیابیطس میں اکثر حالات میں مضر نہیں کہتے حالانکہ وہ تیز میٹھا ہوتا ہے۔ اگر فقط مٹھاس پر نظر رکھی جائے تو بظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ میٹھا ہونے میں اشتراک ہے، اس لیے یہ سب ایک ہی چیز ہوں گے لیکن ایسے کہنے والے کو بے عقل کہا جائے گا۔ اگر کسی کو تربوز کی قاش کھلا کر دریافت کیا جائے اور وہ کہے کہ یہ خربوزہ کی قاش تھی تو آپ یہ کہیں گے کہ نہیں یہ خربوزہ کی قاش نہیں تھی بلکہ تربوز کی قاش تھی۔ آپ نے ایک کے بارے میں نفی تک کر دی حالانکہ وہ میٹھا ہونے میں ایک ہیں۔

بلکہ اس سے بھی زیادہ آگے بڑھ کر آپ تقسیم کرتے ہیں کہ ایک نوع کی چیز میں بھی نفی اور اثبات لاتے ہیں کہ یہ آم سہارنی ہے رٹول نہیں، رٹول ہے ثمر بہشت نہیں، طوطا پری ہے لنگڑا نہیں اور اِن کی قیمتوں کے فرق کو تسلیم کرتے ہیں، وغیرہ۔ اسی طرح باری تعالیٰ کے اسماء صفات سے جو صفات مفہوم ہوتی ہیں اُن میں بھی فرق ہے اور وہ باعتبار مُتَعَلَّقْ کے جدا جدا ہیں، ایک دوسری سے مختلف ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے تابع ہو کر ہی تمام مخلوقات میں اُن کا ظہور ہو رہا ہے اور یہ عجیب الصفات گلدستہ چمن بہار وجود میں آیا ہوا ہے، غرض ہر صفت اپنے اثر و تاثیر کے لحاظ سے جدا ہے حتی کہ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' بھی جس کی تفصیل علماء کرام نے بیان فرمائی ہے۔

اب یہ سمجھئے کہ حق تعالیٰ کی کچھ صفات وجودیہ کہلاتی ہیں اِن ہی کو ''صفاتِ اکرام'' کہا جاتا ہے۔ اور کچھ صفات ''جلالیہ'' اور ''تنزیہیہ'' کہلاتی ہیں، وہ وہ صفات ہیں جن میں حق تعالیٰ کی پاکی، برتری اور عظمت وغیرہ کا ذکر ہو۔ قرآن پاک کی آیت ہے تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ اور اسی آیت مبارکہ سے یہ نام لیے گئے ہیں۔

صفاتِ اکرامیہ یعنی وجودیہ سات ہیں: حیات، ارادہ، علم، قدرت، سمع، بصر اور کلام۔ اس سے یہ بات آپ کے سامنے آ گئی کہ کلام اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے۔ جب اس نے اس صفت سے اپنے بندوں کو نوازا تو انہیں زبان دے دی اور گفتگو سکھا دی۔ گفتگو بغیر عقل اور علم کے نہیں ہو سکتی تھی تو وہ بھی بخشا، اور گفتگو دو قسم کی بخشی۔ ایک وہ کہ جو اپنے دل ہی دل میں انسان کرتا ہے اور دوسری وہ جو زبان سے الفاظ کے پیرائے میں ادا کرتا ہے، جو گفتگو دل ہی دل میں کرتا ہے وہ کلامِ نفسی کے مشابہہ ہے اور بغیر آواز کے ہی اُس کا مفید وجود ذہن میں سچ مچ ہوتا ہے۔ اس میں بات ہوتی ہے کلام ہوتا ہے حتیٰ کہ بعض دفعہ دل ہی دل میں آواز تک کا انسان فرق کرتا ہے کہ یہ بات میں زور سے کہوں گا یہ آہستہ اور یہ کان میں، لیکن دل کے اندر اِس ساری گفتگو میں کہیں زبان نہیں استعمال ہوتی، گفتگو ہوتی ہے اور بلا زبان ہوتی ہے، آواز ہوتی ہے اور بلا آواز ہوتی ہے، چاہے آپ اِسے دل ہی دل میں باتیں کرنا کہہ دیں، چاہے خیال کہہ دیں، چاہے تفکر اور سوچنا کہہ دیں، چاہے منصوبہ کہہ دیں، مگر اِس کا وجود ایسا ہے کہ ہر شخص جانتا ہے اور اِس سارے عمل میں نہ زبان ہوتی ہے نہ آواز، اسی طرح حق تعالیٰ کا کلام ہے وہ زبان اور آواز سے بے نیاز ہے وہ قادرِ مطلق ہے، وہ اپنے ارادہ و قدرت سے کلام فرشتہ پر ظاہر فرماتا اور وہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تک لے آتا (علیہ السلام)۔ اس بات کے سمجھنے کے لیے آلاتِ جدیدہ سے بھی مدد لی جا سکتی ہے مگر بحث طویل ہو جائے گی۔

اگر انسان غور کرے تو گویا اُس پر حق تعالیٰ نے صفتِ کلام کی ایک بارش ہی برسا دی ہے۔ پھر اس صفتِ کلام سے نفع اُٹھانے کی وہ راہیں کھول دیں جو اُس کے قرب و رضا کے حصول کا ذریعہ بنیں اور اُسے ان ہی محدود حروف میں اپنا کلام عطا فرمایا جسے ہم ''قرآن کریم'' کہتے ہیں تاکہ یہ اِسے کانوں سے سنے پھر دل دل میں دہرا کر اور زبان سے ادا کر کے قرب و ثواب حاصل کرے۔ اور کانوں سے سننے پر، دل میں یاد کرنے پر، دماغ میں محفوظ رکھنے پر، زبان سے پڑھنے پر، غرض ہر عمل میں جدا جدا ثواب رکھ دیا۔ سننا جدا عمل ہے سمجھنا اور ہے، دل و دماغ میں دہرانا اور ہے، زبان سے پڑھنا اور ہے، اسلیے سب کا ثواب الگ الگ ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہر نیکی میں دس طرح کا مشینی عمل ہوتا ہے تو ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر رکھ دی گئی ہے، اسی طرح قرآن کریم کے ایک حرف کی ادائیگی کو بھی ایسی نیکی قرار دیا گیا ہے جو دس مرحلوں سے گزر کر وجود میں آئی ہو اور اُسے دس نیکیوں کے برابر فرمایا گیا۔

اب یہ سمجھئے کہ جب ہم تلاوت کرتے ہیں تو جو ہماری زبان سے نکلتا ہے اُسے کلام اللہ کہتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی کہ جیسے آپ روزمرہ کی زندگی میں کسی کی بات نقل کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ''بقول اُس کے'' اور ''یہ اس کا مقولہ ہے'' حتیٰ کہ جھگڑتے وقت کہتے ہیں کہ اُس کے الفاظ یہ نہ تھے یہ تھے، اور اُس نے یہ لفظ نہیں استعمال کیا تھا بلکہ یہ لفظ کہا تھا، اور اشعار نقل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ اقبالؔ کا کلام ہے، یہ اکبرؔ کا کلام ہے، یہ جگرؔ کا کلام ہے، یہ حالیؔ کا کلام ہے، یہ امیر مینائیؔ کا کلام ہے۔ اور جب کلام اقبالؔ سناتے ہوتے ہیں تو یہ جانتے اور تسلیم کرتے ہوتے ہیں کہ آواز اور زبان آپ کی ہے اور کلام اقبالؔ کا ہے۔ ان مثالوں سے آپ بآسانی یہ سمجھ سکیں گے کہ قرآن پاک کلام تو باری تعالیٰ کا ہے اور اُس کا محلِ ظہور آپ کی زبان و آواز ہے۔ محل ادراک آلات دماغیہ ہیں، اور مقر حفظ آپ کا مقرر روح یعنی قلب اور سینہ ہے۔ (نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ اور بَلْ هُوَ اٰيَاتٌۢ بَيِّنَاتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ.). غرض تلاوت کے وقت اِن سب جگہوں پر اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا ظہور ہو رہا ہوتا ہے اور کلام اللہ تعالیٰ ہی کا ہوتا ہے۔ حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو کثرتِ تلاوت کی وجہ سے قرب و نسبت خداوندی حاصل ہوتی ہے وہ بہت مضبوط اور دائمی ہوتی ہے۔

اب یہ بھی سمجھ لیجئے کہ '' کلام اللہ'' اِس حقیقت کے تحت کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مخلوق نہیں ہے۔ مخلوق وہ چیز ہوتی ہے جو ذات باری تعالیٰ سے جدا ہو۔ اللہ کی صفات اس سے جدا نہیں ہیں وہ مخلوق نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے اس کے کلام کو مخلوق بالکل نہیں کہا جاسکتا، ہاں مخلوق جیسے انسان اس کا محل ظہور ہوسکتا ہے اور فرشتہ جیسے جبرئیل علیہ السلام و اسرافیل علیہ السلام اس کو اپنے اندر ضبط کر کے ایک مقام سے نبی کریم علیہ السلام تک پہنچانے والے ہو سکتے ہیں اور الف با تا (یا۔اے۔بی۔سی) اس کے سمجھنے کے تحریری اشارے ہو سکتے ہیں اور اس کلام پر دلالت کرنے والے بن سکتے ہیں اور کوئی بھی مخلوق کلامِ الٰہی کے ظہور کی جگہ ہوسکتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے درخت محل ظہورِ کلام اور محلِ نزول وحی بنا دیا گیا تھا جنہوں نے قرآن پاک کو کلام الٰہی کے بجائے کلام رسول کہا، اُن کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے :

فَقَالَ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۝ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۝ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ .

(پ ۲۹ سُورۂ مدثر)

''تو کہا اور کچھ نہیں یہ جادو ہے چلا آتا، اور کچھ نہیں یہ قول ہے آدمی کا، اب میں اُس کو ڈالوں گا آگ میں''۔

''قرآن کو مخلوق سمجھنے کی غلطی''

عہدِ اسلام میں چار فرقے ضلالت کی جڑ قرار دیئے گئے ہیں اور باقی فرقے اِن ہی میں سے پیدا ہوتے گئے ہیں، وہ یہ ہیں :

'' قدریہ '' . '' رافضہ '' . '' خوارج '' اور '' جھمیہ '' اور معتزلہ نے مسائل صفات میں جھمیہ ہی سے عقائد اخذ کیے۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ مامون الرشید کے دور میں '' بِشْرِ مُرَیْسِیْ '' جو فرقہ معتزلہ کا بڑا شیخ تھا، مع اپنے ہم خیالوں کے اس کا مقرب بن گیا، مامون کو علم کا شوق تھا مگر علمی پختگی حاصل نہ تھی، اس کے دور میں ۲۱۸ھ سے یہ فتنہ اُٹھا اور ۲۳۱ھ تک چلتا رہا۔ مامون کے بعد معتصم پھر اُس کا بیٹا واثق سب اِسی باطل خیال کے تھے (حتیٰ کہ متوکل علی اللہ کا زمانہ آیا اور اس کی اصلاح ہوئی)۔

ان لوگوں نے اس فتنہ کو سرکاری سطح پر لا کر بہت بڑھانا چاہا۔ مگر امام احمد بن حنبلؒ وغیرہم اور علماء حق نے سختی سے تردید کی، آپ دو سال چار ماہ قید رہے اور قتل ہوتے ہوتے بچے۔ مامون الرشید کی موت کے بعد معتصم نے انہیں جیل سے لا کر دربار میں پیش کیا تو امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن پاک اور احادیث سے استدلال کیا اور ان لوگوں نے منطق اور فلسفہ کی رُو سے بحث کی۔ خدا نے عقل کا استعمال قرآن وحدیث سمجھنے کے لیے دُرست قرار دیا ہے نہ کہ قرآن وحدیث کے مقابلہ کے لیے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ گفتگو میں عمدہ ترین جوابات دیتے رہے اور ان سے مطالبہ فرماتے رہے کہ کوئی دلیل قرآن وحدیث کی لاؤ حتیٰ کہ تنگ آ کر معتصم کے قاضی قضاۃ (چیف جسٹس) احمد بن ابی دؤاد نے کہا کہ تم بس یہی کہتے ہو کہ '' قرآن اور حدیث لاؤ''۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ اسلام بھی تو یہی حکم دیتا ہے (میں نے کیا نئی بات کہہ دی)۔ یہ بات ۲۵ رمضان ۲۲۱ھ کی ہے۔ ان شریر لوگوں نے خلیفہ کو ورغلایا اور اُس نے آپ کے کوڑے لگائے اور آپ کو گھر بھیج دیا۔ کوڑے ایسے لگائے گئے تھے کہ جن سے ان کے جسم کے لوتھڑے جو بے جان ہو گئے تھے کاٹنے پڑے۔ کوڑوں کی کم از کم تعداد تیس ذکر کی گئی ہے۔ شفایاب ہونے کے بعد بھی آپ نے گھر سے باہر مسجد میں جمعہ یا جماعت کے لیے جانا بند کر دیا حتیٰ کہ متوکل کا زمانہ آیا اور یہ فتنہ فرو

ہوا۔اوراس نے اہلِ حق کی پوری طرح مدد کی،امام احمدؒ کی غایت درجہ اکرام کیااورآپ کی وفات تک ہرخاص وعام کی یہی حالت رہی،ایسے مواقع پرحق تعالیٰ کی طرف سے رُوحانی تائید ہوا کرتی ہے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ دیا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے معتمد ربیع کوایک خط دے کرمصر سے بغداد امام احمدؒ کے پاس بھیجا،صبح کی نماز کے بعد وہ ان سے ملے اورخط پیش کیا،امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے اس خط کو پڑھا ہے۔ربیع نے جواب دیا کہ نہیں، پھرانہوں نے خود خط پڑھا توان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ربیع نے دریافت کیا کہ اے ابوعبداللہ اس میں کیا لکھا ہے۔انہوں نے جواب دیا کہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ''انہوں نے (امام شافعیؒ نے) جناب رسول اللہ ﷺ کوخواب میں دیکھا: آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابی عبداللہ احمد بن حنبل کولکھواس میں میری طرف سے سلام پہنچادواوراُن سے یہ کہہ دو کہ عنقریب تمہاری آزمائش ہوگی اورخلقِ قرآن کا قائل کرنے کی کوشش ہوگی، اُن لوگوں کی بات نہ ماننا، اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے تمہارانشان بلندرکھے گا''۔

ربیع کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے کہا مجھے اس خوشخبری کی مٹھائی دیجئے۔توانہوں نے اپنی وہ قمیص جوان کی جلد سے لگی ہوئی تھی مجھے اُتار کردے دی۔

جب میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس واپس پہنچااورواقعہ سنایا توانہوں نے فرمایا کہ میں تم سے قمیص تونہیں مانگتا کہ تمہیں دُکھ ہوگالیکن ایسا کروکہ اسے پانی میں ڈبوکرتبرک کے لیے وہ پانی مجھے دے دو۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اوربھی سب اکابرِدین اپنی اپنی جگہ اس مسئلہ کا اعلان کرتے رہے سمجھاتے رہےاورمناظروں کا جواب دیتے رہےلیکن ان میں سب سے عظیم شخص''احمد بن نصرخزاعی'' ہیں ان کی شہادت کو متوکل کی اصلاح میں دخل ہے۔

احمد بن نصرابن مالک ابن الہیثم الخزاعیؒ:

۲۳۱ھ میں ایک جلیل القدر بزرگ احمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کوشش بھی کی کہ اس فتنہ کو جہاد بالسیف سے ختم کردیا جائے۔احمد رحمہ اللہ علیہ کے دادا مالک اُن مخصوص ترین لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قیام سلطنت عباسیہ کے لیے پوری قوت صرف کردی، اِن کے والد نصر کی بھی معروف ترین شخصیت تھی اور بغداد میں سویقہ نصر کے نام سے ایک بازار بھی تھا۔

خود احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ائمہ سنت میں شمار ہوتا ہے۔ حماد بن زید، سفیان بن عیینہ اور امام مالک رحمہم اللہ سے احادیث کی تعلیم حاصل کی تھی اور امام علمِ حدیث یحییٰ بن معین ان کے شاگردوں میں ہیں۔ احمد بن نصر رحمہ اللہ نے خلیفہ کے سامنے کھلے دل سے مان لیا تھا کہ میں نے یہ کارروائی اقامتِ سنت کے لیے کرنی چاہی تھی اور خلیفہ واثق نے اِس کا اثر زیادہ نہیں لیا تھا لیکن جب مجلس شاہی میں عقیدہ کے بارے میں سوالات ہوئے تو اُس نے خود اپنے ہاتھ سے ان کو شہید کیا۔ اور عمرو بن معدیکرب کی صمصامہ نامی مشہور تلوار سے وار کیے۔ اس کے بعد ان کا سر مبارک سرِ عام الگ لٹکا دیا گیا اور جسم ایک تنے سے الگ باندھ دیا گیا اور پہرہ بٹھا دیا گیا۔

۲۸ رشعبان ۲۳۱ھ کو ان کا سر مبارک لٹکایا گیا، ۲۳۷ھ کو عید الفطر کے ایک یا دو دن بعد اُتارا گیا، باطل کا عروج اور ظلم اپنی حد کو پہنچ چکا تھا، خدا نے کیا کہ واثق بھی اِن کے شہید کرنے کے بعد چین سے نہ رہا، بیمار رہنے لگا تھا حتی کہ اس واقعہ کے ایک سال چند ماہ بعد ہی خود واثق ۳۶ سال کی عمر میں ۲۳۲ھ کو بعارضہ استسقاء مر گیا۔ اور ۲۴ رذی الحجہ ۲۳۲ھ بروز چہار شنبہ زوال کے وقت متوکل علی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور وہ خلیفہ ہوا۔

”خدا کی راہ میں قربانیوں کی قبولیت اور قدرتی طور پر اصلاحِ حال کی ابتداء“

بعض ارکان دولت نے احمد بن نصرؒ کی شہادت کے وقت اور بعد میں عجیب حالات دیکھے تھے۔ ان میں عبد العزیز بن یحییٰ الکنانی بھی ہیں، انہوں نے مناسب موقع پا کر متوکل سے احمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک واقعہ نقل کیا کہ ان کے شہید ہونے کے بعد بھی اِن کے سر کے حصہ سے قرآن پاک کی تلاوت کی آواز ایسی آتی رہی جیسے زبان پڑھتی ہو۔

اس بات کو سن کر متوکل محزون اور خوفزدہ ہوا کہ بھائی نے ایسے امام مقرب بارگاہ کو شہید کر کے غلطی کی، اتنے میں اس کا وزیر محمد بن عبد الملک بن الزیّات آ گیا، اُس سے متوکل نے کہا کہ میرے دل میں احمد بن نصرؒ کے بارے میں تردد ہے۔ اس نے جواباً بیان دیا کہ امیر المؤمنین واثق نے احمد بن نصر کو مسلمان نہیں بلکہ کافر ہونے کی حالت میں مارا تھا۔ اگر یہ حلف غلط ہو تو اپنے بارے میں کہا کہ خدا آگ میں جلائے۔ پھر ثمہ آیا، اُس نے اسی طرح کا حلفیہ اور خود کو بددُعا والا بیان دیا کہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ پھر احمد بن ابی دُوَاد آیا، اُس نے بھی اسی طرح کا قسمیہ بیان اور اپنے کو فالج کی بددُعا دی۔

مگر متوکل کے ذہن میں بات بیٹھ چکی تھی اور اُس کی تقویت ہی ہوتی چلی گئی کہ ماہ صفر ۲۳۳ھ میں

ابن الزیّات کو آگ میں ڈال دیا گیا اور اسی طرح اس کی موت واقع ہوئی اور اسی سال اس واقعہ کے تین ماہ بعد احمد بن ابی دُوَاد کو فالج ہو گیا اور سات سال اسی طرح وہ درسِ عبرت بنا رہا۔

کچھ ہی عرصہ بعد ھرثمہ مفرور ہو گیا اس کا کہیں قبیلۂ خزاعہ سے گزر ہوا، ایک شخص نے اِسے پہچان لیا اور اہلِ قبیلہ سے کہا کہ یہ تمہارے ابن عم احمد بن نصر خزاعیؒ کا قاتل ہے۔ انہوں نے اسے اس طرح قتل کیا کہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ متوکل بعد میں ان تینوں کی جھوٹی قسم اور اُن پر خدائی عتاب کا ذکر کرنے لگا حتی کہ ۲۳۷ھ میں اس کی اصلاح ہو گئی اور یہ فتنہ بحمد اللہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ متوکل نے ۲۳۷ھ میں عید الفطر کے پہلے یا دوسرے دن احمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ کا سر مبارک اُتروایا، سولی سے جُثہ مبارک اُتارا گیا جسے ورثہ کے حوالے کر دیا گیا۔ انہوں نے (سر اور جسم مبارک کو) ملا کر مقبرہ مالکیہ میں دفن کیا، جنازہ پر لوگوں کا زبردست ہجوم ہو گیا اور لوگ خوشی سے بے برداشت ہو گئے۔ اس فتنہ کے آغاز سے تمام دُنیا کے ائمہ حدیث فقہاء اور متکلمین نے اس مسئلہ کو تحریراً وضاحت سے بیان کرنا شعار بنا لیا جو آج تک پڑھا پڑھایا جاتا ہے اور پھر یہ مسئلہ کبھی نہیں اُٹھا۔ **والحمد للّٰہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللّٰہ .**

آخر میں قرآن کریم کی یہ فضیلت بیان کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسے بغیر سمجھے ہوئے پڑھنے میں ثواب ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، کہ الم پر ثواب ملتا ہے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ ان حروف کا ترجمہ رسول اللہ ﷺ نے نہیں بتلایا نہ ہی کسی کو معلوم ہے۔ اندازہ لگانا اور اشارات کے نکات پیدا کرنا الگ بات ہے۔ ترجمہ یا تفسیر کا کوئی عالم بھی مدعی نہیں ہے مگر اِن حروف مقطعات ہی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا کہ ''میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام اور حرف ہے میم اور حرف ہے''۔ اور فرمایا کہ ہر حرف پر دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک کی تلاوت کی طرف بھی ضرور توجہ کرنی چاہیے، جو مرد عورتیں اور بچے سمجھ نہیں پاتے اور پڑھ سکتے ہیں وہ جب تک اس خیال سے کہ یہ خدا کا کلام ہے پڑھتے یا سنتے رہیں گے انہیں برابر ثواب ملتا رہے گا چاہے ترجمہ سمجھ میں آتا ہو یا نہ آتا ہو۔

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین .